ایس-امین الحسن ★

قربانی و کردار کا معیار
تحریکی تاریخ کے حوالے سے

ہماری اس گفتگو کی نوعیت علمی نہیں بل کہ Motivational ہے۔ یعنی ترغیب کے ذریعے جذبہ ومحرک عمل کو ابھارنا۔ اس مقصد کے لیے کچھ واقعات کے حوالے سے بات کروں گا۔ اس لیے کہ قصے اور واقعات انسان کو متوجہ کرتے ہیں اور سننے کی رغبت پیدا کرتے ہیں۔ آگے بڑھنے سے پہلے میں قربانی اور کردار کے سلسلے میں کچھ عرض کرنا چاہوں گا۔

قربانی

انسان جو کچھ ظاہر میں کرتا دکھائی دیتا ہے، اس کے پیچھے باطن میں ایک محرک ہوتا ہے، جسے Driving force یا Drive State کہا جاتا ہے۔ مثلاً بھوک ایک حیاتیاتی محرک ہے، جو کھانے پر آمادہ کرتا ہے، پیاس کا احساس ایک محرک ہے جو پانی پینے پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ محرکات سرد پڑ جائیں یا آسودہ ہو جائیں تو نہ بھوک لگے گی نہ پیاس۔ اس کے برعکس اگر محرک بپا ہو جائے تو آدمی کے اندر بے قراری پیدا ہو جاتی ہے تا آنکہ وہ چیز حاصل ہو جائے۔ جماعت سے وابستگی بھی ایک محرک ہے، اسی طرح اپنی صلاحیتوں کا اظہار، خدا سے قربت، بندوں کی خدمت، جماعت اور سماج میں عزت واحترام کا مقام یہ سب سماجی محرکات ہیں۔ ان کے حصول سے فرد نفسیاتی اطمینان، روحانی سکون، اطمینان قلب، سعادت مندی، خود اعتمادی اور خوش نصیبی محسوس کرتا ہے۔

بعض دفعہ دو محرکات کے درمیان کشمکش ہو جاتی ہے۔ ایک طرف معاش کی راہ میں ترقیاں، دوسری طرف روحانی مسرتیں اور خدمت دین کے مواقع۔ ایسے میں ایک طرف قوت سے آگے بڑھ جانا، دوسرے محرک کو حد اعتدال میں رکھتے ہوئے قربانی کہلاتا ہے۔ اس کو ایک تاریخی مثال سے بھی سمجھ سکتے ہیں۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

★ رکن مرکزی مجلس شوریٰ جماعت اسلامی ہند

''آخر کار مجھ پر یہ عیاں ہوگیا کہ آخرت کی سعادت اگر ہے تو اس میں کہ انسان دنیا سے اپنے قلب کا تعلق منقطع کرلے، ہمیشہ کے گھر کی طرف رجوع کرے اور عزم صمیم اور ہمت بلند کے ساتھ اللہ کے راستے پر گامزن ہوجائے اور یہ سب کچھ اُس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک جاہ وعمل سے اعراض اور دنیا کے مشاغل وعلائق سے اپنے آپ کو کاٹ نہ لیا جائے۔ میں نے اپنے احوال پر نظر ڈالی تو اپنے آپ کو علائق میں چاروں طرف سے گھرا اور ان کے اندر ڈوبا ہوا پایا۔ میں اپنی اس حالت پر ایک مدت تک مسلسل غور کرتا رہا۔ میرے دل میں شدید کشمکش پیدا ہوگئی۔ ایک روز میں ہر نشے سے دست کش ہوکر بغداد چھوڑ دینے کا ارادہ باندھتا ہوں اور اگلے روز اس ارادے کو توڑ دیتا ہوں۔ ایسا بھی ہوا کہ میں نے قدم اٹھانے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر پھر کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ صبح طلب آخرت کی رغبت دل میں پیدا ہوتی اور شام خواہشوں کا لشکر اس پر حملہ کر دیتا اور یہ رغبت ان کی یلغار میں تہس نہس ہوکر رہ جاتی۔ حالت یہ ہوگئی کہ شہوانیت دنیا مجھے اپنی زنجیروں سے اپنی جانب کھینچتی اور ایمان کا منادی پکارتا الرحیل الرحیل- چلو چلو، عمر تھوڑی سی باقی رہ گئی ہے اور درپیش سفر لمبا ہے۔ علم وعمل کی جس دنیا میں تم کھڑے ہو وہ ریا اور خیال کی دنیا ہے۔ آخرت کی تیاری اب نہیں کروگے تو کب کروگے۔ یہ علائق اب نہیں کاٹوگے تو کب کاٹوگے۔ دنیوی خواہشیں اور آخرت کے دواعی کے درمیان یہ کشمکش تقریباً چھ مہینے جاری رہی۔

ہر طرف سے عاجز ومایوس اور ہر سعی میں ناکام ہوکر میں نے اپنے اللہ سے التجا کی، ایسی التجا جو ایک مضطر انسان سارے سہارے ٹوٹ جانے کے بعد کرتا ہے اور اللہ نے جو ہر دل مضطر کی التجا قبول کرتا ہے، میری التجا قبول کرلی۔ مجھ پر مشکل آسان ہوگئی۔ بغداد چھوڑ دینے کا عزم ہر دوسری خواہش پر غالب آگیا۔'' (امام غزالی، از آبادشاہ پوری، ص: ۸-۱۰)

کردار

جس طرح کسی چمن کا حُسن اُس کے رنگ برنگ کے خوشنما پھولوں سے وابستہ ہے، اُسی طرح اِنسان کا حسن اُس کا کردار ہے۔ کردار پھول ہے تو افکار اس کے بیج ہیں۔ افکار وخیالات زندگی کے مقاصد متعین کرتے ہیں، مقصد محرک عمل بن کر ہمیں عمل پر آمادہ کرتا ہے۔ اعمال کی تکرار کو عادت کہتے ہیں اور بہت سی خوشگوار عادتوں کی ترتیب سے حسن کردار پیدا ہوتا ہے۔ یہاں کردار سے ہماری مراد حسنِ کردار ہے۔

تحریکی قافلے میں ایسے بے شمار قائد ہمیں میسر آئے ہیں، جن کی زندگی اس قافلے کے راہی کے لیے مشعل راہ اور مینارۂ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان بزرگوں کی کاوشوں اور قربانیوں سے تعارف کی دو ہی شکلیں ہیں یا تو اُن کے بیچ رہا جائے اور ان کی زندگی کا مشاہدہ کیا جائے یا ان کی پرامنگ اور حوصلہ مند زندگی کا مطالعہ کیا جائے۔ جو ہستیاں اب ہمارے درمیان نہیں رہیں، ان کے بہت کم ہی شخصی خاکے دستیاب ہیں۔ ہندستان کی جماعت کو اس پہلو سے سوچنا چاہیے۔ شخصیتوں کا تعارف شخصیتوں کی قدردانی بھی ہے اور ان کے افکار، اقدار اور روایات کو اگلی نسلوں تک منتقل کرنا بھی۔ ہم اپنے بزرگوں کی قدردانی نہیں کرتے تو نتیجے میں ہماری بھی قدردانی نہیں ہوتی۔ ہم شخصیتوں سے دلچسپی نہیں لیتے تو ہم سے بھی کسی کو غرض نہیں ہوتی۔ ہماری خواہش دعا کی شکل میں یوں ڈھلنی چاہیے:

'اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر'

جب ہم یہ خواہش کرتے ہیں کہ آنے والے لوگ ہمارا ذکر خیر کریں تو قرآن کا حکم یہ بھی ہے کہ ہم اپنے گزرے ہوئے لوگوں کو دعا اور نیک نامی سے یاد کریں۔

'اور جو ان کے بعد آئے کہتے ہیں: اے ہمارے رب ہماری مغفرت فرما اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی، جنھوں نے ایمان لانے میں ہم پر سبقت کی اور ہمارے دلوں میں اُن کے لیے جو ایمان لائے کینہ نہ رکھ۔ ہمارے رب یقیناً تو بڑا شفیق اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔'

اس فرصت میں میں تحریکی تاریخ سے تین افراد کی زندگی کی کچھ جھلکیاں پیش کروں گا، جن میں ایک خاتون بھی شامل ہیں۔ وہ تین نام اس طرح ہیں:

۱-مولانا افضل حسین، ۲-ایم-اے-جمیل، ۳-عذرا بتول صاحبہ

مولانا افضل حسین

۹۲ سال قبل ۱۹۱۸ میں ضلع بستی، یوپی میں مولانا افضل حسین کی پیدائش ہوئی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے B.A اور M.A کیا۔ پھر L.T کی سند حاصل کی۔ ۴۸-۱۹۳۹ تک Teachers Traning College جھانسی میں لکچرار کی حیثیت سے کام کررہے تھے۔ دریں اثنا ۴۴ میں رکن جماعت بن گئے۔ ہندستان کی آزادی اور تقسیم کے بعد ۱۹۴۸ میں ملیح آباد میں منعقد شوریٰ کے اجلاس میں طے پایا کہ ان کی ہمہ وقتی خدمات درس گاہ اسلامی رام پور کے لیے لی جائیں۔ یہاں سے ان کی زندگی کی کایا پلٹ ہوتی ہے۔ یہاں میں مرحوم کی زندگی کے تین اہم کارناموں کا ذکر کرنا چاہوں گا۔

پہلا کارنامہ

قیام جماعت کے روزِ اول سے تعلیم کا ایک منصوبہ تھا۔ اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے درس گاہ اسلامی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کی نظامت سنبھالنے کے لیے اُن سے خواہش کی گئی کہ اپنی ملازمت ترک کرکے وہ اُس خاکے میں رنگ بھریں۔ انھوں نے بلا عذر اور بلا جھجک اپنی خدمات پیش کردیں۔ کہنے کو تو وہ ناظم تھے، مگر بیک وقت استاد بھی تھے اور صدر مدرس اور اتالیق (Warden) بھی۔ درس گاہ ۲۰×۱۵ کی گھاس پھوس کے عارضی چھپر کے نیچے درس گاہ ملیح آباد کے باغ میں شروع کی گئی۔ افضل حسین صاحب نے کمال سادگی کے ساتھ لنگی اور قمیص پہنے، مٹی کے تودے پر بیٹھ کر پڑھانا شروع کیا، جو ان کی 'کرسی' تھی۔ ۲۰، ۲۵ بچے بورے پر بیٹھے ہوئے۔ بعد میں رام پور میں عالی شان عمارت تعمیر ہوگئی۔ یہاں انھوں نے ایک نئی نفسیات کی بنیاد پر مدرسہ کی اٹھان اٹھائی اور بچوں کی اسلامی تعلیم وتربیت کا عملی مظاہرہ کیا۔

جب پہلا مہینا اختتام کو پہنچا تو امیر جماعت مولانا ابواللیث ندویؒ کو تشویش ہوئی کہ ایک لکچرار جس کی تنخواہ اُس زمانے میں ۴۰۰ یا ۵۰۰ روپے تھی، اُس کو جماعت کیا کفاف عطا کرسکتی ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے لکھا ہے کہ امیر جماعت نے سوسو کے چار پانچ نوٹ ٹیبل پر رکھ دیے اور افضل حسین صاحب سے کہا کہ آپ بقدر کفاف اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے جو چاہیں اٹھالیں۔ افضل حسین صاحب نے تردد کے ساتھ ایک نوٹ اٹھالیا۔ یہی ان کا مشاہرہ تھا۔

دوسرا کارنامہ

ان کا دوسرا عظیم کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے فیلڈ میں ایسا زبردست کارنامہ پیش کیا کہ بہت کم لوگوں کو ایسی سعادت ملتی ہے۔ نرسری سے آٹھویں جماعت تک کی تمام درسی کتابوں کو نئے اسلوب سے مرتب کیا۔ بچوں کی ذہنی سطح اور نفسیات کو پیش نظر رکھا۔ بڑی بڑی باتوں کو آسان ترین زبان اور غیر محسوس طریقے سے دلوں میں راسخ کر دیا۔ ان کے مضامین میں توحید، توکل، دعوت دین، اقامت دین، دینی اور تنظیمی دورے وغیرہ کا ذکر ملتا ہے۔ دوسری اور تیسری جماعت میں جو مضامین میں نے پڑھے ہیں، آج بھی یہاں میں انھیں سنا سکتا ہوں۔ وہ نصاب کی یہ کتابیں رات میں لال ٹین جلا کر تیار کیا کرتے تھے۔ یہ کارنامہ اکیلے انھوں نے انجام دیا، جو پوری ایک اکیڈمی کے کرنے کا ہے۔ ۶۵ سے زائد کتابیں انھوں نے لکھی ہیں، للہ، فی اللہ اور لوجہ اللہ کا جذبہ تھا کہ انھوں نے اپنی کتابوں کی رائلٹی نہیں لی۔

تیسرا کارنامہ

ان کا تیسرا عظیم کارنامہ ان کی کتاب 'فن تعلیم و تربیت' ہے۔ یہ کتاب مولانا مودودیؒ کے نظریہ تعلیم کے مطابق تیار کی گئی ہے۔ مولانا مودودیؒ کے نظریات کو ۳ نکتوں میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے: (الف) دنیا میں امامت و قیادت کا مدار علم پر ہے (ب) انقلاب امامت کے لیے انقلاب تعلیم ناگزیر ہے (ج) اس نظام کو نافذ کرنے کے لیے معلمین کی تربیت کی جائے۔

یہ کتاب ایک لاجواب کتاب ہے، جس کے بارے میں احباب نے لکھا ہے کہ افضل حسین صاحب کو Noble Prise Award ہونا چاہیے۔ یہ کتاب بہت سے ٹیچرس ٹریننگ کالجوں میں شامل نصاب نہیں مگر کالج کے اساتذہ اُس کو پڑھ کر آتے ہیں۔ اس عظیم شخصیت کے کردار کی بلندی کے لیے یہ بات کافی ہے کہ وہ قیم جماعت تھے۔ مولانا محمد سراج الحسن صاحب ۱۹۸۶ء میں جب قائم مقام امیر جماعت بنے تو اُس وقت ان کی بے نفسی اور اعلیٰ اخلاق کا یہ عالم تھا کہ مولانا محمد سراج الحسن صاحب فرماتے ہیں:

> 'اُس دوران ان کے سمع و طاعت کے انداز نے مجھے بہت زیادہ متاثر کیا۔ اس کے باوجود کہ افضل حسین علم، تقویٰ، تحریک سے لگاؤ اور ایثار و قربانی میں ہر اعتبار سے مجھ سے بہت اونچے اور افضل تھے، انھوں نے اس موقع

پر جس سمع وطاعت کے جذبے کے تحت میری اس عارضی امارت میں بحیثیت قیم میرا تعاون کیا، وہ میرے لیے حد درجہ متاثر کن تھا۔ حالاں کہ اس سے پہلے خود میں بحیثیت سکریٹری جماعت ان کے تحت معاون کے طور پر کام کرتا رہا۔ ان کی زندگی کے یہ پہلو اس بات کو واضح کرتے ہیں کہ بے نفسی، اعلیٰ ظرفی اور تواضع کی یہ صفات کتنے اونچے درجے پر مرحوم میں موجود تھیں اور اہل نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ مذکورہ صفات عالیہ کا حصول کتنے ریاض وسعی کا طالب ہوتا ہے۔' (مولانا افضل حسین نمبر،ص:۲۷، شائع کردہ رفیق منزل دہلی)

(۲) عذراء بتول مرحومہ

ڈاکٹر عذریٰ بتول ۱۹۵۹ میں پاکستان میں پیدا ہوئیں۔ لاہور سے میڈیکل پاس کیا۔ طالب علمی ہی کے زمانے سے اسلام کے لیے متحرک وفعال تھیں۔ ۱۹۷۷ میں ۱۸ برس کی عمر میں Political Agitation میں حصہ لیا، پولیس کا گھیرا توڑ کر اسمبلی ہال تک پہنچ گئیں۔ آخر کار Arrest بھی ہوگئیں۔ مولانا مودودیؒ نے پولیس کے ذمے داروں کو انتباہ کردیا تھا کہ 'ہماری ہر لڑکی اور خاتون شام ہونے سے قبل اپنے اپنے گھر پہنچائی جائے' الحمدللہ رہا ہوگئیں۔ منصورہ سے تفہیم القرآن کا کورس مکمل کیا۔ دعاؤں کا التزام کرتیں اور دوسروں کو بھی مسنون دعائیں سکھاتیں۔

محترمہ عذرا بتول جمعیت الطالبات کی ناظمہ صوبہ پنجاب بھی ہوئیں اور اُس کی مرکزی مجلس شوریٰ کی رکن بھی تھیں۔

۱۹۸۵ میں ان کی شادی ہوئی، ۶ ماہ کے اندر سرکاری ملازمت کو اوکاڑہ گاؤں میں منتقل کرلیا۔ سسرالی خاندان بڑا تھا۔ شوہر لیاقت بھی ڈاکٹر تھے۔ ان کے دو بڑے بھائیوں نے بڑی قربانیاں دے کر انھیں پڑھایا تھا۔ عذرا نے ہمیشہ ان کا یہ احسان یاد رکھا اور ہمیشہ ان کے حقوق ادا کیے۔ گوشت، کھانا، کپڑا ہی نہیں اپنی کمائی سے حاصل شدہ زمین بھی ان کے نام لکھ دی۔

شادی کی رات کا واقعہ ڈاکٹر لیاقت لکھتے ہیں کہ عذراء نے پوچھا کہ کیا آپ نے شکرانے کی نفل نماز پڑھ لی۔ ڈاکٹر لیاقت نے جواب دیا کہ آج مصروفیات میں مغرب اور عشا

چھوٹ گئی۔ کل پڑھ لوں گا۔ عذرا نے کہا کہ نئی زندگی کا آغاز بے برکتی سے نہیں ہونا چاہیے۔ لہٰذا وہ اٹھے، وضو کی، نماز ادا کی۔ پھر بیوی سے بات چیت کی۔ دونوں میاں، بیوی نے ایک کلینک کھولا، پھر رفتہ رفتہ وہ گاؤں کا سب سے بڑا اور خوبصورت ہسپتال بن گیا۔ مریضوں سے حسن سلوک کرنا، دین کی تلقین کرنا، کبھی فیس معاف کر دینا یہ سب ان کا شعار رہا۔

ان کی گھریلو زندگی بھی مکمل رہی۔ ۱۰ بچوں کو جنم دیا۔ ایک بچی کا انتقال ہو گیا۔ بڑا لڑکا ۱۷ سال کا تھا، چھوٹی بیٹی ۱۰ ماہ کی۔ ساتھ میں جیٹھ کے ۵ بچوں کو بھی اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ شوہر کے کپڑے خود تیار کرتیں، جوتے خود پالش کرتیں۔ بل کہ کبھی کبھار جیٹھ صاحب گھر آ جاتے تو ان کے جوتے بھی پالش کر دیتیں۔ گھر سے باہر جانا ہوتا تو شوہر سے اجازت لیتیں۔ خود ماہانہ لاکھوں روپیہ کماتیں مگر شوہر سے پوچھ کر خرچ کرتی تھیں۔

مرحومہ بڑی مہمان نواز تھیں۔ اکثر جماعت کے اجلاس ان کے گھر میں ہوتے تھے۔ اُس وقت وہ خود باورچی خانے جا کر کھانا پکاتیں۔ بیٹے کو بلا کر سورۂ یٰسین پڑھ کر دم کرتیں اور کہتیں کہ بیٹے ابو تو ۱۵ آدمی کا کھانا کہہ کر گئے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ۲۵-۳۰ لوگ آ جائیں، اس لیے کھانا کم نہیں پڑنا چاہیے۔

گاؤں میں غریب مزدور خواتین میں زیادہ کام کرتی تھیں۔ وہ Strright forward تھیں۔ ہیر پھیر کی باتوں کو حکمت نہیں منافقت سمجھتی تھیں۔ ۴۴ سال کی عمر میں ایک کار حادثے کا شکار ہو کر شہید ہو گئیں۔ ان کی موت کے بعد ان کے شوہر جو جماعت کی کئی ذمے داریوں پر فائز ہیں، مرکزی شوریٰ کے بھی رکن ہیں، درد و سوز میں ڈوبی ہوئی رقت آمیز تحریر رقم کی ہے:

> 'عذرا ۱۸ سال قبل اس گھر میں بہو بن کر چوتھے نمبر پر آئی تھیں۔ آج گئیں تو صرف اس خاندان کی شفیق ماں نہ گئیں، بل کہ ہزاروں کی تعداد میں لوگوں کے سر سے شفقت کا سایہ اٹھ گیا۔ آج سات ماہ سے اوپر ہونے کو آئے ہیں، عذرا مر کر زندۂ جاوید ہو گئی۔ وہ اپنی نیکیوں کی وجہ سے زندہ ہے اور اپنے بچوں کی شکل میں زندہ ہے۔ اپنی بے پناہ خوبصورت یادوں میں زندہ ہے۔ بے شمار مریضوں اور لوگوں کی دعاؤں میں زندہ ہے۔ وہ تو ہر وقت ہر جگہ اپنے حسنات میں زندہ ہے۔ اگر نہیں اب ملتا تو لوگوں کو وہ

لیاقت نہیں ملتا جو کبھی عذرا بتول کا شوہر ہوا کرتا تھا۔ بچوں کا گلہ ہے کہ ان کا باپ بدل گیا ہے۔ مریضوں کو شکایت ہے کہ ان کا طبیب وہ نہیں رہا اور جماعت کے کارکنوں کو یہ گلہ ہے کہ ان کے امیر کو نہ جانے کیا ہوگیا ہے۔ خود مجھے یوں لگتا ہے کہ وہ لیاقت مر گیا ہے جو کبھی عذرا کا جیون ساتھی ہوا کرتا تھا۔ میں اس کے لیے کوئی تاج محل تو شاید کبھی نہ بنا سکوں، مگر خدا کے فضل سے اس کے لیے میں اور میری اولاد نیکیوں کا تاج محل ضرور بنائیں گے۔' ('عذرا بتول سعادت کی زندگی، شہادت کی موت' ص:۳۷۶)

کسی نے محترمہ عذرا بتول کے شوہر سے پوچھا کہ عذرا کی سب سے بڑی نیکی کون سی تھی جو اللہ کے ہاں مقبول ہوئی ہوگی۔ جواب میں دیا کہ نیکیاں تو اس کی بے شمار ہیں، مگر ایک نیکی اس کی ایسی تھی جو لازماً سب سے زیادہ درجہ لے گئی ہوگی کہ 'اس کی زبان سے پوری زندگی کسی کا دل نہ دکھا۔'

اس نیک مثالی خاتون کے بارے میں پروفیسر غفور احمد صاحب پرنم آنکھوں کے ساتھ تعزیت ادا کرتے ہوئے کہنے لگے: 'ڈاکٹر صاحب انھوں نے زیادہ عرصہ زندہ رہ لیا ایسے لوگ تو اتنا عرصہ زندہ نہیں رہا کرتے۔'

(۳) ایم اے جمیل احمد مرحوم

ایم اے ایم جمیل احمد صاحب شہر وانمباڑی ریاست تامل ناڈو کے ایک متمول خاندان میں ۱۹۲۷ میں پیدا ہوئے۔ تعلیم اوسط تھی۔ گڑ اور اِملی کا کاروبار کرتے تھے۔ غالباً ۶۳ یا ۶۴ میں اُس وقت کے امیر حلقہ نے جمیل صاحب کو تامل دارالاشاعت کی ذمے داری سونپ دی۔ جب کہ وہ خود تامل زبان کے ماہر نہیں تھے۔ معمولی بول چال کرلیا کرتے تھے۔ تحریک نے ذمے داری ڈال دی تو انھوں نے اس میں یدطولیٰ حاصل کرلیا ہے۔ جماعت کے کاموں میں اتنا شوق لگن سے کام کرن لگے کہ آخرکار اپنی تجارت کو خیر باد کہنا پڑا۔

جمیل صاحب منفرد آدمی تھے۔ وہ منفرد سوچ رکھتے تھے۔ تخلیقی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ ان کے لگائے ہوئے انوکھے پودے آج تامل ناڈو میں شجر ہائے سایہ دار بنے ہوئے ہیں۔ اس نوعیت کے بے شمار ادارے اور حلقوں میں بھی پائے جاتے ہیں، مگر جمیل صاحب کے پروان

چڑ حائے ہوئے ادارے آج بھی منفرد ہیں۔

(ii) Islamic Foundation Tmt:IFT تامل دارالاشاعت کا نام ہے۔ یہاں وہ مترجم بھی تھے، مترجموں کے سردار بھی اور ادارے کے ذمے دار بھی۔ زبان و بیان کی نوک پلک درست کرنے سے لے کر کاغذ، پرنٹنگ اور بائنڈنگ کی تکنیکی باریکیوں تک سے وہ واقف تھے۔ ضرورت کے تحت وہ خود ماہرین سے کتابیں لکھواتے بھی تھے جیسے "اتمہان" وغیرہ۔ طباعت وغیرہ میں اعلیٰ ترین کوالٹی کا اہتمام کرتے تھے۔ آج یہ ادارہ مختلف Book fairs میں حصہ لیتا ہے اور اس کی کتابیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوتی ہیں۔

قرآن کا ترجمہ بڑی عرق ریزی سے جمیل صاحب کی نگرانی میں ہوا۔ تامل زبان کے ایک ایک ماہر تک پہنچتے اور اس سے پڑھواتے اور چیک کرواتے تھے۔ چونکہ وہ PR کے بھی آدمی تھے۔ ان کے تعلقات اعلیٰ صلاحیت کے لوگوں میں تھی۔ وہ بلا جھجک بڑے سے بڑے آدمی کے پاس پہنچ جایا کرتے تھے۔

(ii) سمرسم: سمرسم تامل زبان میں تحریک کا ترجمان ہے۔ قرآن مجید اور دوسری کتابوں کے ترجمے میں اس میں قسط وار اس میں شائع ہوتے تھے۔ ایک زمانے تک جمیل صاحب اس کے ذمے دار رہے۔ اس کی زبان کی فصاحت تامل ادیبوں میں مسلم ہے، اس مقام تک سمرسم کو پہنچانے میں جمیل صاحب کی کاوشوں کا دخل ہے۔

(iii) Islamic Centre Vellore :ICV نومسلموں کی تربیت کا ایک انوکھا ادارہ ہے، جس کے بانیوں میں ایم اے جمیل صاحب بھی تھے۔ ۱۹۷۸ میں یہ ادارہ قائم ہوا اور آج تک اس ادارے سے ہزاروں نومسلم حضرات وخواتین فارغ ہو چکے ہیں۔ یہ اپنے انداز کا منفرد ادارہ ہے۔ یہاں تعلیم مردوں کو بھی دی جاتی ہے اور عورتوں کو بھی۔ پڑھے لکھے لوگ بھی آتے ہیں اور دیہاتی بھی۔ کوئی ایک سال فارغ کرسکتا ہے تو کوئی ایک ہفتہ پڑھنا چاہتا ہے۔ کوئی بوڑھا ہے تو بچے بھی اس Centre میں پڑھتے آتے ہیں۔ یہ ادارہ بھی جمیل صاحب کی تخلیقی صلاحیت کا مظہر ہے۔

(iv) Manude vasantan: تحریک اسلامی کی صفوں میں یہ بھی ایک منفرد پروگرام ہے جو ہر ہفتہ باقاعدہ Tv سے نشر ہوتا ہے۔ اس کے بھی جمیل صاحب ذمے دار تھے۔

(v) دعوت: دعوت کا جذبہ ان کے سینے میں موجزن تھا۔ وہ اس درد کو دوسروں کو کے سینوں میں منتقل کرنے کے گر سے بھی واقف تھے۔ آج ہندستان میں کئی داعیوں کی خدمات ان کی مرہون منت ہیں۔

جمیل صاحب فرد شناس اور افراد ساز تھے۔ بے شمار باصلاحیت نوجوانوں کو انھوں نے تیار کیا۔ ان کے شاگردوں میں دو نسلیں بیک وقت شامل ہیں۔ ایسا وہ اس لیے کر سکے کہ وہ Genration Gap کے قائل نہیں تھے۔ البتہ اُن کے ساتھ کام کرتے ہوئے بعض لوگوں کو Gen Gap محسوس ہوا۔ وہ انتہائی متحرک انسان تھے۔ میں نے ان کو IFT میں کام کرتے کرتے میز پر ہی سر رکھ کر سو جانے اور صبح دنماز کے بعد پھر کام وہیں سے جاری رکھتے ہوئے دیکھا ہے۔

آخر کے زمانے میں اپنے گھر وانمباڑی لوٹ کر آنا پڑا۔ اس دوران میں نے ان میں تین باتیں نوٹ کیں۔

(الف) کسی کی شکایت نہیں۔ اپنی زندگی کا گلہ یا کسی ذمے دار کے سلوک اور رویے کی شکایت تو دور کی بات اُس کا اشارہ تک ان کی گفتگو سے نہیں ملتا تھا۔

(ب) نوجوانوں کو بال و پر عطا کرنے، ان سے نوجوان ملاقات کو جاتے تو ان کی صلاحیتوں کے وہ معترف ہوتے اور ان کو مزید نکھارنے کی ترغیب دیتے۔ ان کو دعائیں سکھاتے اور یہ بات بتاتے کہ بچے باپ کے کندھے پر بیٹھ کر کبھی کبھی باپ سے اونچا ہو جانے کا احساس انھیں ہو جاتا ہے حالاں کہ باپ انھیں کندھے پر اٹھائے ہوئے ہے۔ بیٹا جب بڑا ہو جانے کا ذکر کرتا ہے تو باپ خوش ہوتا ہے، سراہتا ہے یہ نہیں کہتا کہ تم میرے کندھوں پر سوار ہو، خود بینی کی بیماری سے بچنے کی تلقین کرتے اور اس کے لیے دعائیں سکھاتے۔

(ج) قرآن فہمی: قرآن پر غور و فکر کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ وہ آیتوں کو نئے نقطۂ نظر سے دیکھتے اور اس فن کو سکھاتے بھی تھے۔ تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں وفات پائے۔ اللہ ان کی قبر کو نور سے منور کرے۔ امیر جماعت مولانا سید جلال الدین عمری نے ایک مرتبہ ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ 'میں نے تحریک میں بہت ہی کم لوگوں کو جمیل صاحب جیسا پایا جو ہمیشہ تحریک کی ترقی کی فکر کیا کرتے تھے۔'

★★